روزوں کے تعلق سے رمضان کی تخصیص

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہ
شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

بزرگو اور بھائیو! یہ مبارک مہینہ جس سے ہم اور آپ گذر رہے ہیں: رمضان شریف کا مہینہ ہے، اور اللہ تعالیٰ جس کو جتنی توفیق دیتے ہیں اتنا وہ نیک اعمال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس مبارک مہینہ کی قدر کرنے کی اور زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

اس مبارک مہینہ کے تعلق سے قرآن وحدیث میں بہت سی باتیں ذکر کی گئیں ہیں، اس وقت مجھے وہ سب ذکر نہیں کرنی، وہ آپ حضرات نے سن بھی رکھی ہونگی اور پڑھ بھی رکھی ہونگی، مجھے آج مختصر وقت میں صرف دو باتیں عرض کرنی ہیں:

خاص رمضان کے روزے کیوں فرض کیے گئے ہیں؟:...... پہلی بات: قرآنِ کریم میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے خاص رمضان کے روزے کیوں لازم کیے گئے ہیں؟ دوسرے گیارہ مہینوں میں روزے کیوں نہیں رکھے گئے؟ آدمی کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ رمضان کے روزے فرض کرنے میں کوئی نہ کوئی حکمت ہونی چاہئے، اگرچہ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم اللہ کے فیصلوں پر اعتراض نہیں کرتے، مگر حکمت جاننا چاہتے ہیں کہ اللہ نے باقی گیارہ مہینوں میں روزے فرض نہیں کیے، صرف اسی مہینہ میں فرض کیے، آخر اس میں حکمت کیا ہے؟

حکمت جاننے کا ہر مؤمن کا جذبہ ہوتا ہے، قرآن وحدیث میں بہت سے احکام کی اللہ نے حکمتیں بیان کی ہیں، اللہ کے رسولؐ نے بھی حکمتیں بیان کی ہیں، اور جو باقی چھوڑی ہیں وہ علمائے امت نے بیان کی ہیں۔

کپڑا ٹخنے سے اوپر پہننے کی حکمت:...... مثلاً احادیثِ شریفہ میں یہ حکم آیا ہے کہ اپنا کپڑا خواہ لنگی ہو، پائجامہ ہو، پتلون ہو، ٹخنے سے نیچے مت جانے دو، اگر ٹخنہ چھپ گیا تو جتنے حصہ کو کپڑا چھپائے گا وہ حصہ جہنم میں جائے گا، اور ایسا تو ہوتا نہیں کہ ایک انگلی جہنم میں جائے اور باقی جسم جنت میں جائے۔ جب کچھ حصہ جہنم میں جائے گا تو باقی جسم بھی جہنم

میں جائے گا۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ جو شخص ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہنتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف مہربانی کی نظر نہیں فرماتے۔ یہ حکم سبھی مسلمان جانتے ہیں، لیکن آدمی کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حکم کیوں ہے؟ اس میں مصلحت کیا ہے؟ یہ مصلحت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر سمجھائی ہے۔

شمائل ترمذی میں مختصر روایت ہے اور مفصل روایت دوسری کتابوں میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بازار تشریف لے گئے، وہاں ایک صحابی کھڑے تھے، وہ دوسری طرف منہ کر کے کھڑے تھے، حضورؐ نے پیچھے سے آکر دونوں ہاتھوں سے ان کی آنکھیں دبا دیں، انھوں نے کہا: کون ہے؟ چھوڑ مجھے! لیکن حضورؐ نے دبائے رکھا، چھوڑا نہیں، اب جو اُن صحابی نے پہچاننے کی کوشش کی تو پہچان گئے کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اب انھوں نے آنکھیں چھڑانے کے بجائے اپنی پیٹھ برکت حاصل کرنے کے لئے حضورؐ کے سینہ سے لگادی، کیونکہ ایسا موقعہ پھر کہاں ملے گا، یہ موقعہ تو آج اتفاق سے مل گیا۔ اب حضورؐ نے ہاتھ ہٹالئے، کیونکہ کھیل ختم ہوگیا۔

انہی صحابی کے لئے آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے: أُزْهَرُ بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْهُ: ازہر ہمارا گاؤں ہے اور ہم اس کا شہر ہیں، یہ صحابی دیہات کے تھے، اور ہر جمعہ کو جمعہ پڑھنے کے لئے مدینہ منورہ آتے تھے، اور جب دیہات سے آتے تھے تو دیہات میں کھیتوں میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں، سبزیاں، ترکاریاں وغیرہ، ان سب کو جمع کر کے حضورؐ کے لئے ہدیہ لایا کرتے تھے، اور جمعہ پڑھ کر اپنے گاؤں لوٹ جاتے تھے، لوٹتے وقت حضورؐ گھر کی ضروریات مثلاً نمک، مرچ، ہلدی وغیرہ بازار سے خرید کر ان کو ہدیہ دیتے تھے۔ اس بات کی طرف حضورؐ نے اشارہ فرمایا ہے کہ ازہر ہمارا گاؤں ہے یعنی وہ ہماری دیہات کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور ہم اس کا شہر ہیں یعنی ان کی شہری ضرورتیں ہم پورا کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ازہر کی لنگی کی طرف دیکھا تو وہ ٹخنوں سے نیچے تھی، حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اِرْفَعْ إِزَارَكَ فَإِنَّهُ أَنْقَىٰ وَأَبْقَىٰ: لنگی اونچی اٹھاؤ، لنگی اونچی باندھنے میں دو فائدے ہیں: ایک: اس سے کپڑا پاکیزہ اور صاف رہتا ہے، نیچے ہوگی تو زمین پر لگے گی، اور جوتوں کے ساتھ لگے گی، جو لوگ نیچے تک کپڑا پہنتے ہیں آپ دیکھیں: ان کے نیچے کے حصے سڑے ہوئے اور بدبودار ہوتے ہیں، پس حضورؐ نے کپڑے کو اونچا رکھنے میں ایک حکمت تو یہ سمجھائی کہ اس سے کپڑا صاف رہتا ہے۔

کیا روزانہ کپڑے بدلنے ضروری ہیں؟:...... یہ بہت بڑی حکمت ہے کہ آدمی صاف ستھرا رہے، اور یہ جو غیر مسلم امریکہ و یورپ وغیرہ میں روزانہ کپڑے بدلتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی بعض مسلمان بھی روزانہ کپڑے بدلتے ہیں: یہ کوّے ہیں جو کبوتر کی چال چلتے ہیں! ہمیں روزانہ کپڑے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہمارے لئے تو ہفتہ میں دو مرتبہ کپڑے بدلنا کافی ہے۔

اور ان کو روزانہ اس لئے بدلنے پڑتے ہیں کہ وہ کاغذ سے استنجاء کرتے ہیں، پانی استعمال نہیں کرتے، پس جب کاغذ سے استنجاء کر کے پتلون پہنیں گے اور وہ بھی تنگ تو وہ شام تک بیت الخلاء بن جائے گی، اتنی سڑ جائے گی کہ دوبارہ پہننے کے قابل نہیں رہے گی، اس لئے دوسرے دن کپڑے بدلنا ان کی مجبوری ہے، لیکن مسلمانوں کو کیا آفت ہے کہ وہ روزانہ کپڑے بدلتے ہیں، مسلمان تو چھوٹا استنجاء کرتا ہے تو پانی استعمال کرتا ہے، بڑا استنجاء کرتا ہے تو پانی استعمال کرتا ہے، اس کے کپڑوں اور بدن پر تو ناپاکی کا ایک قطرہ بھی نہیں لگتا، پھر اس کے کپڑے صبح سے شام تک کیسے میلے ہو گئے کہ دوسرے دن ان کو بدل دیا جائے۔

بہر حال جو مسلمان نماز پڑھتا ہے وہ ہمیشہ پاک صاف رہتا ہے، اب اگر اس کا کپڑا نیچے تک لٹکا ہوا ہوگا تو وہ جوتے پر بھی لگے گا، زمین پر بھی لگے گا اور کسی گندی جگہ پر بھی لگ سکتا ہے، اور جب نچلا حصہ ناپاک ہو گیا تو اب وہ نماز کیسے پڑھے گا؟ لہٰذا اس کو اپنی لنگی، پائجامہ، پتلون وغیرہ جو بھی اس نے پہن رکھا ہے، اس کو زمین سے اتنا اوپر رکھنا چاہئے کہ ناپاکی سے لگنے کا موقعہ ہی نہ آئے، پس ایک حکمت تو حضورؐ نے یہ بیان فرمائی کہ اس میں صفائی ہے، پاکیزگی ہے!

دوسری حکمت: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمائی کہ اگر لنگی اونچی پہنی جائے گی تو کپڑا جلدی پھٹے گا نہیں اور نیچی پہنے گا تو چلتے وقت کپڑا پاؤں میں الجھے گا اور جب کپڑا پاؤں میں پھنسے گا تو آدمی چلتے چلتے گر بھی سکتا ہے اور کپڑا بھی جلدی پھٹے گا۔ اور اونچا پہنا ہوگا تو چلتے وقت کپڑا الجھے گا نہیں اور جلدی پھٹے گا بھی نہیں، یہ کپڑا اونچا پہننے میں اقتصادی فائدہ ہے۔

جب یہ دو باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ازہر رضی اللہ عنہ کو بتائیں تو ان میں سے جو پہلی حکمت تھی اس کے بارے میں تو انھوں نے کچھ نہیں کہا، لیکن جو دوسری حکمت تھی کہ کپڑا زیادہ دنوں تک چلتا ہے اس کے بارے میں انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! إِنَّمَا هِيَ بُرْدَةٌ مَلْحَاءُ: اے اللہ کے رسول! یہ تو لٹھے کی لنگی ہے، چار پیسے کی ہے، جلدی پھٹ جائے گی تو کیا پریشانی ہے! کوئی قیمتی کپڑا تو ہے نہیں کہ آدمی اس کو احتیاط سے استعمال کرے، انھوں نے بات ٹھیک ہی کہی تھی، مگر حضورؐ نے ان کی بات کا جواب نہ دے کر بات دوسری طرف پھیر دی اور ارشاد فرمایا: أَمَا لَكَ فِيَّ أُسْوَةٌ: کیا تیرے لئے میرے اندر نمونۂ عمل نہیں؟!

اصل بات کا جواب نہ دینا اور بات کا رخ پھیر دینا:...... جواب دینے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ کسی سے گفتگو ہو رہی ہو اور مخاطب ہماری بات کا جواب دیدے تو پھر اس کی بات کا جواب دینا بھی ایک طریقہ ہے، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بات کا رخ پھیر دیا جائے۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس بادشاہ کے پاس جو خدائی کا دعوے دار تھا اللہ کی دعوت لے کر گئے اور اللہ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا: ﴿رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾: میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، بادشاہ نے جواب دیا: یہ کام تو میں بھی کرتا ہوں ﴿أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ﴾: میں بھی

زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اور اس نے حکم دیا کہ جیل خانے سے ایک ایسے آدمی کو جس کو پھانسی کا حکم ہو چکا ہے بلاؤ، جب وہ لایا گیا تو نمرود نے کہا: جا میں نے تجھے معاف کر دیا! اور ایک بے گناہ راستہ چلتے ہوئے آدمی کو بلایا اور اس کی گردن اڑا دی اور کہا: دیکھو میں نے اس کو قتل کر دیا جس کو پھانسی کا حکم ہو گیا تھا، میں نے اس کو معاف کر دیا، پس زندہ تو میں بھی کرتا ہوں اور مارتا بھی ہوں۔

اس بے وقوف کو کون سمجھائے کہ اس کا نام زندہ کرنا اور مارنا نہیں ہے، مگر وہ بادشاہ تھا، خدائی کا دعویدار تھا، غرور اس کے دماغ میں بھرا ہوا تھا، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، بلکہ دوسری دلیل پیش کی، فرمایا: میرا پروردگار وہ ہے جو روزانہ مشرق سے سورج نکالتا ہے اگر تو خدا ہے تو کل سورج مغرب سے نکال: ﴿فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ﴾: پس وہ حیران رہ گیا کہ کیا جواب دے۔

مجھے اس مثال سے سمجھانا یہ ہے کہ کسی سے گفتگو ہو رہی ہو اور وہ ہماری بات کا جواب دیدے اور وہ جواب غلط ہو مگر اس کی غلطی واضح کرنے کا موقع نہ ہو تو پھر جواب کا جواب دینے سے بہتر یہ ہے کہ بات کا رخ پھیر دیا جائے اور دوسرے انداز سے بات کی جائے۔

غرض: جب حضرت ازہر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ تو لٹھے کی لنگی ہے! چار پیسے کی ہے! جلدی پھٹ جائے گی تو کیا نقصان ہے؟ سسری کو پھینک دیں گے اور دوسری لے آئیں گے، پس حضورؐ نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا حالانکہ اس کا جواب تھا۔

میانہ روی سے خرچ کرنا آدھی کمائی ہے:......اس کا جواب کیا ہے؟ جواب: مال اللہ کی نعمت ہے اور انسان مال میں منیجر ہے، مالک نہیں ہے ﴿جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ﴾: اللہ نے ہمیں مال میں منیجر بنایا ہے، پس ایک ایک پیسہ صحیح طریقہ پر استعمال کرنا: یہ اسلام کی تعلیم ہے، حدیث شریف میں ہے: **الاقتصاد نصف المعیشة**: میانہ روی سے خرچ کرنا آدھی کمائی ہے، اگر آپ مہینہ میں پانچ ہزار روپے کماتے ہیں تو ڈھنگ سے خرچ کرنے کی صورت میں وہ دس ہزار کا کام دیں گے، اور اگر آپ ان کو بے ڈھنگے طریقہ پر خرچ کریں گے تو وہی پانچ ہزار روپے ڈھائی ہزار کا کام کریں گے۔

مال مایۂ زندگانی ہے:......قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مال کو لوگوں کے لئے سہارا فرمایا ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾: اور نہ دو تم کم عقلوں (یتیموں) کو ان کے وہ مال جس کو اللہ نے تمہارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے، یعنی زندگی مال کے سہارے قائم ہے۔ اس آیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مال کتنی اہم چیز ہے، اتنی اہم چیز کو اناپ شناپ اڑا دینا سمجھداری کا کام نہیں، چیز جتنی اہم ہوتی ہے اتنی ہی احتیاط کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے، لہٰذا اگر آپ یہ سمجھیں کہ میرے پاس تو پیسے بہت ہیں، اس لئے ایک گڈی صبح چولہے میں جلا کر ناشتہ پکائیں، اور ایک گڈی شام کو تو مال کئی دن چلے گا؟ ٹھیک ہے آپ کے پاس مال بہت ہے، مگر اس طرح

گڈیاں جلا جلا کر کھانا پکانا حرام ہے، اس لئے کہ پیسہ لوگوں کے لئے سہارا ہے۔ اس کو فضول خرچ کرنا جائز نہیں۔

فرد کی مالداری قوم کی مالداری ہے:...... یہاں ایک اہم بات سمجھ لینی چاہئے، اور وہ ایک سوال کا جواب بھی ہے، سوال یہ ہے کہ ہر فرد کے پاس مال کہاں ہے، مال تو مالداروں کے پاس ہے، پھر مال (تمام) لوگوں کے لئے سہارا کیسے ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فرد کی مالداری قوم کی مالداری ہے، اور فرد کی ناداری قوم کی ناداری ہے، کیونکہ ہر آدمی ملت کا فرد ہے، پس اگر ملت کا کوئی فرد کمزور ہوگا تو پوری ملت کمزور ہوگی اور ملت کے افراد مضبوط ہونگے تو پوری ملت مضبو ہوگی، جیسے ہاتھ کی کوئی انگلی کمزور ہوگی تو پورا ہاتھ کمزور ہوگا، اور ایک انگلی مضبوط ہوگی تو تمام انگلیوں کو اس کی طاقت پہنچے گی، پس ملت کے بعض افراد اگر کمزور ہوں گے تو ان کی کمزوری کا اثر ملت تک پہنچے گا اور ملت کے افراد مضبوط ہوں گے تو پوری قوم اس کی طاقت محسوس کرے گی، اس لئے اگر کوئی کہے کہ میرے پاس مال ڈھیروں ہے، اس لئے گڈیاں جلا جلا کر کھانا پکاؤں گا تو یہ حرام ہے، کیونکہ تیرے پاس جو مال ہے وہ صرف تیرا نہیں ہے، اس مال سے پوری ملت کو فائدہ پہنچنا ہے، رہے گا اگر چہ وہ تیرے ہی پاس لیکن ملت اس کے ذریعہ سے قوت پائے گی، لہٰذا مال کو سلیقہ کے ساتھ اور پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا یہ شریعت کی تعلیم ہے۔

غرض: ان صحابی کو یہ جواب دیا جا سکتا تھا کہ ٹھیک ہے لٹھے کی لنگی ہے، معمولی قیمت کی ہے، مگر ہے وہ بھی مال! اسے بھی قاعدہ سے استعمال کرنا چاہئے، وہ اگر چار دن سے زیادہ چلتی ہے تو وہ بھی انسان کے لئے سہارا ہے، لیکن حضورؐ نے یہ جواب نہیں دیا، بلکہ بات پھیر دی اور فرمایا: **أَمَالَکَ فِيَّ أُسْوَةٌ**: کیا تیرے لئے میری ذات میں کوئی نمونہ نہیں! یعنی تو مجھے مشعل راہ کیوں نہیں بناتا؟ اب جو حضرت ازہرؓ نے حضورؐ کی لنگی پر نظر ڈالی تو اس کو آدھی پنڈلی تک بندھا ہوا پایا، پس انھوں نے فوراً اپنی لنگی آدھی پنڈلی پر باندھ لی۔ جب حضورؐ کا نمونہ سامنے آیا تو اب کوئی سوال باقی نہ رہا، اور جہاں تک حضورؐ کی لنگی تھی وہیں تک اپنی لنگی بھی باندھ لی!

احکام کی سب سے بڑی حکمت اللہ ورسول کا فرمان ہے:...... اور اس حدیث شریف سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کو احکام کی حکمت جاننی چاہئے، لیکن اگر کسی حکم کی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ وہ اللہ ورسول کا حکم ہے، یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد کسی اور حکمت کی ضرورت نہیں رہتی، یہی سب سے بڑی حکمت ہے۔

روزے: رمضان ہی کے کیوں فرض ہیں؟...... اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿**شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ**﴾: رمضان کے روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآنِ کریم اتارا گیا ہے، اور قرآن کریم اللہ کا کلام ہے، وہ اللہ کی صفت ہے، اللہ کی آخری کتاب ہے اور قیامت تک اس کو باقی رہنا ہے، اتنی اہمیت رکھنے والی کتاب اس مہینے میں اتاری گئی ہے، اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ کسی دن میں یا

کسی مہینہ میں کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے تو وہ دن اور مہینہ یادگار بن جاتا ہے، جیسے ہمارے ہندوستان میں ۲۶ جنوری اور ۱۵ اگست کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ ملک کی آزادی کے تعلق سے ان دنوں میں بڑا واقعہ پیش آیا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رمضان کو اہمیت اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ اس میں ایک بہت بڑا واقعہ پیش آیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں قرآن اتارا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی تین صفتیں:......قرآنِ کریم کی کیا اہمیت ہے؟ ارشاد فرمایا: ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾: یہ قرآن تمام لوگوں کے لئے راہ نما کتاب ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں، تمام لوگوں کے لئے راہ نما ہے اور قرآن کریم کے شروع میں جو ہے: ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾: یعنی قرآنِ کریم پرہیزگاروں کے لئے راہ نما کتاب ہے، ان دونوں آیتوں میں بعض لوگ تعارض سمجھتے ہیں، لیکن اگر آپ غور کریں تو ان میں کوئی تعارض نہیں۔ قرآن کے شروع میں جو آیت ہے وہاں یہ تھوڑے ہے کہ یہ صرف متقیوں کے لئے ہدایت ہے، صرف کا لفظ استعمال نہیں کیا، پھر جب دوسری آیت میں فرمایا کہ قرآن تمام لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے تو متقی بھی اس میں شامل ہو گئے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ یہ چیز دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ہے، پھر کسی موقعہ پر کہے کہ یہ چیز ایشیا والوں کے لئے ہے تو اس میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ تمام انسانوں کے اندر ایشیا والے بھی داخل ہیں، پس جب تمام انسانوں کے لئے قرآن کتاب ہدایت ہے تو اس میں متقی بھی آگئے، ان کے لئے بھی یہ کتاب: کتاب ہدایت ہے۔

گفتگو کے مواقع مختلف ہوتے ہیں:......اور اگر کوئی کہے کہ چلو مان لیا کہ ان میں تعارض نہیں، مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کہا ہے؟ یہ اسلوبِ بیان بدلا ہوا کیوں ہے؟ ایک جگہ کہا کہ یہ متقیوں کے لئے کتاب ہدایت ہے، اور دوسری جگہ کہا کہ یہ تمام لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ گفتگو کے مواقع مختلف ہوتے ہیں، ایک موقعہ تعریف کا ہوتا ہے اور ایک موقعہ اظہار حقیقت کا، یعنی بات صاف صاف بیان کرنے کا، دونوں موقعوں کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں، مثلاً کسی ملک کی تاریخ لکھنی ہو تو تاریخ میں سب چیزیں بتائی جائیں گی کہ اس ملک میں یہ جانور ہیں، ان جانوروں میں کتے، خنزیر، لومڑیاں وغیرہ سب گنائے جائیں گے، جتنے کیڑے مکوڑے ہیں سب گنائے جائیں گے، غرض ملک میں جو بھی چیز ہے اچھی ہو یا بری وہ سب گنائی جائے گی، کیونکہ وہ کتاب ملک کی حالات پر لکھی جارہی ہے، اور اگر اسی ملک کا بادشاہ یا وزیر اعظم مہمان آئے، اور اس کی تعریف میں سپاس نامہ پڑھا جائے، اور اس میں آپ پڑھیں کہ ان کے ملک میں اتنے خنزیر ہیں اور اتنے کتے ہیں تو لوگ وہیں ماریں گے، وہاں تو اس کی تعریف میں بڑی بڑی چیزیں ذکر کی جائیں گی کہ یہ وہ صاحب ہیں جن کے ملک میں ایسے ایسے سائنس دان ہیں، ایسے ایسے انجینئر اور فلاسفر ہیں، غرض جو قابل تعریف چیزیں ہوتی ہیں وہی سپاس نامہ میں لکھی جاتی ہیں، دوسری چیزیں نہیں لکھی جاتیں، قرآنِ کریم کے شروع میں قرآن کی تعریف کی جارہی تھی،

اس لئے وہاں جو اہمیت رکھنے والی چیز تھی اس کا تذکرہ کیا اور فرمایا: ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾: یہ کتاب متقیوں کے لئے راہ نما ہے، دنیا میں جو بڑے بڑے لوگ ہیں انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین وہ سب اس کتاب کے محتاج ہیں، اس کتاب کی راہ نمائی کے بغیر یہ بڑے بڑے حضرات بھی کامیاب نہیں ہو سکتے، اتنے بڑے لوگوں کا اس کتاب کا محتاج ہونا یہ قرآن کی تعریف ہے، اور اگر یوں کہیں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی جاہلوں کو ضرورت ہے تو یہ قرآن کی کیا تعریف ہوئی؟ جاہل کو تو بہر حال ضرورت ہوتی ہے۔ اور آیت ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ میں قرآن کی تعریف نہیں کی جارہی ہے، بلکہ قرآن کی حقیقت سمجھائی جارہی ہے کہ رمضان میں جو قرآن اتارا گیا ہے وہ کس مقصد سے اتارا گیا ہے، فرمایا: ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾: وہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر اتارا گیا ہے۔ یہ قرآن کی پہلی صفت ہے۔

خیر کی طرح شر بھی اللہ کے قبضہ میں ہے:...... اس فرق کو ایک مثال سے سمجھو! قرآنِ کریم میں ایک جگہ اللہ کی تعریف ہے: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾: اے اللہ! اے ملک کے مالک! جس کو آپ چاہتے ہیں ملک دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں ملک لے لیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ذلت سے ہم کنار کرتے ہیں، آپ کے قبضہ میں خیر ہے۔

سوال یہ ہے کہ شر کس کے قبضہ میں ہے؟ وہ بھی تو اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، پھر صرف ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ کیوں کہا؟ اور دوسرا حصہ کیوں چھوڑ دیا؟ جواب: یہاں اللہ کی تعریف کی جارہی ہے، تعریف کے موقعہ پر یہ کہنا کہ اے اللہ! آپ کے ہاتھ میں خیر بھی ہے اور شر بھی یہ تعریف کے منافی ہے، اس لئے اس کو چھوڑ دیا اور فرمایا: ﴿إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾: آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ اس طرح جو بات چھوڑ دی تھی اس کو دوسرے انداز میں بیان کر دیا۔ غرض: تعریف کے موقعہ پر تعریف کا پہلو اجاگر کیا جاتا ہے اور دوسرے موقعہ پر بات کھول کر سمجھائی جاتی ہے۔

قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ﴾: اس آیت میں مضمون یہ ہے کہ کافر جو نبیوں کے مخالف ہیں، جب ان کو خیر پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: ﴿هٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾: یہ خیر تو اللہ نے پہنچائی، اور اگر انہیں برے احوال پہنچتے ہیں تو وہ اپنے پیغمبر سے کہتے ہیں: ﴿هٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ﴾: یہ نحوست تمہاری وجہ سے آئی ہے، تم جیسا منحوس آدمی ہماری قوم میں پیدا ہوا اس لئے یہ مصیبتیں آئیں، قرآن نے نبیوں سے کہا: ان کو جواب دو: ﴿قُلْ: كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾: سب حالات اللہ کی طرف سے آتے ہیں، یہاں چونکہ اظہار حقیقت کا موقعہ ہے، اس لئے فرمایا کہ اچھے اور برے سب حالات اللہ کی طرف سے آتے ہیں اور وہاں: ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾: کہہ کر شر کو چھوڑ دیا۔

غرض: گفتگو موقعہ کے اعتبار سے کی جاتی ہے، چونکہ قرآن کے شروع میں قرآن کی تعریف کی جارہی ہے، اس لئے

کہا: یہ قرآن متقیوں کے لئے کتاب ہدایت ہے اور یہاں چونکہ قرآن کی حقیقت بیان کی جارہی ہے اس لئے فرمایا: قرآن تمام لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے۔

قرآن میں ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں:...... دوسری خوبی قرآن کی یہ ہے کہ اس میں ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں: ﴿وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ﴾: اتنی آسان اور واضح کتاب کہ ہر انسان خواہ مرد ہو عورت ہو، شہری ہو دیہاتی ہو، عالم ہو یا جاہل ہو ہر کوئی قرآن کی بات سمجھ سکتا ہے۔

قرآن: فرقان ہے!...... اور تیسری خوبی اس کی یہ ہے کہ یہ فرقان ہے، جدا کرنے والی کتاب ہے، یعنی اس قرآن نے آکر دودھ اور پانی کو الگ الگ کر دیا ہے، کفر اور ایمان میں خط امتیاز کھینچ دیا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے۔

جب ایسی اہمیت رکھنے والی کتاب اس مہینہ میں اتاری گئی ہے تو اس مہینہ کو بھی کوئی اہمیت ملنی چاہئے، اس لئے فرمایا: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾: پس جو تم میں سے اس مہینے کو دیکھے وہ اس مہینے کے روزے رکھے، اس سے معلوم ہوا کہ اس مہینہ کے روزے اس لئے رکھے گئے ہیں کہ اتنی اہم کتاب اس مہینہ میں اتاری گئی ہے۔

رمضان میں دو چیزیں اہم ہیں:...... خلاصہ یہ نکلا کہ اس مہینہ میں دو چیزیں اہمیت رکھنے والی ہیں، ایک قرآن ہے، اور قرآن کی اہمیت پورے بارہ مہینے ہے، لیکن اس مہینہ میں اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ دوسری: خود اس مہینہ کی بھی اہمیت ہے، اس لئے اس مہینہ میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں، روزہ اور تراویح۔ روزہ وقت کی اہمیت کا حق ادا کرنے کے لئے ہے اور تراویح قرآنِ کریم کا حق ادا کرنے کے لئے ہے اور یہی دو عبادتیں اس مہینہ کی خاص عبادتیں ہیں۔

روزہ اور تراویح مؤمن کے لئے سفارش کریں گے:...... اور حدیث شریف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے دن روزہ اور قرآن دونوں مؤمن کے لئے سفارش کریں گے، روزہ کہے گا: اے پروردگار! میں نے آپ کے اس بندے کو کھانے پینے سے اور لذتوں سے دن بھر روکے رکھا اور یہ مسلسل رکا رہا لہٰذا میں اس کے لئے سفارشی بن کر آیا ہوں، آپ میری سفارش قبول فرمائیں، اور اس کی مغفرت فرمائیں۔ اور قرآن کہے گا: خدایا! میں نے اس کو رمضان کی راتوں میں سونے نہیں دیا، اس نے میری بات مانی اور وہ سویا نہیں اور مجھے پڑھتا رہا اور میرا حق اس نے ادا کیا اس لئے خدایا میں آپ کی بارگاہ میں سفارشی بن کر آیا ہوں، لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرمائیں، اور اس کی بخشش فرمائیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ان دونوں کی سفارش قبول فرمائیں گے اور اس مؤمن کی بخشش فرمادیں گے جس نے دونوں کا حق ادا کیا ہے، یہ حدیث بیہقی کی شعب الایمان میں ہے، اور مشکاۃ کی کتاب الصوم (حدیث ۱۹۶۳) میں ہے، پس یہی دو عبادتیں اس مہینہ میں اہم ہیں، اگر ہم ان کا حق ادا کر دیں تو بیڑا پار ہے۔

بھاری عبادتوں کو آسان بنانے کا فارمولہ:...... لیکن یہ دونوں عبادتیں بھاری ہیں اور جب روزے گرمیوں میں آتے ہیں تو اور بھی بھاری ہو جاتے ہیں، گرمی تو ہوتی ہی ہے، اور دن بھی بڑا ہو جاتا ہے، ایسے میں کاشتکار کو کھیت میں ہل چلانا

پڑتا ہے، چھٹی نہیں کرسکتا، کیونکہ کوئی دو دن کا تو مسئلہ نہیں، پورے مہینہ کا کام ہے، اور رات میں سونے کو بڑا دل چاہتا ہے، مگر کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا پڑتا ہے اس لئے حضورؐ نے اُن حدیثوں میں جو میں نے خطبہ میں پڑھی ہے اس بھاری اور مشکل کام کو آسان بنانے کا فارمولہ بیان فرمایا ہے۔

وہ فارمولہ ہے: إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا۔ ایمان کے جو معنی معروف ہیں، وہ یہاں مراد نہیں۔ یہاں ایمان کے معنی ہیں: یقین، اور احتساب کے معنی ہیں: ثواب کی امید رکھنا۔ پس اس جملہ کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ نے اعمال پر جو ثواب کے وعدے کئے ہیں: اس پر پختہ یقین رکھنا، اور اس کو نظروں کے سامنے لانا یہ مشکل سے مشکل کام کو نہایت آسان بنا دیتا ہے۔

اس کی تھوڑی تفصیل یہ ہے کہ اللہ نے جو احکام ہم پر لازم کئے ہیں وہ بیگار نہیں ہیں۔ بیگار کا مطلب ہے: مفت میں کام لینا، پرانے زمانے مین راجے مہاراجے لوگوں سے مفت میں کام لیتے تھے، اس کو بیگار کہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہمارے خالق و مالک ہیں اور ہم ان کے بندے ہیں، وہ ہمارے پالنہار ہیں اور ہم ان کا رزق کھاتے ہیں وہ جو حکم دیں ہمارے لئے ان کو بجالانا ضروری ہے، وہ اس کے بدلہ میں کچھ بھی نہ دیں تو بھی انہیں حق پہنچتا ہے، مگر انھوں نے ہم سے بیگار نہیں لی، بلکہ یہ کہا کہ کام کرو ہم اتنا ثواب دیں گے۔ یہ جو ثواب کے وعدے اللہ نے کئے ہیں ان وعدوں کو نگاہوں کے سامنے لایا جائے تو کام ہلکا ہو جائے گا۔

جیسے ایک آدمی ہے، اسے معلوم ہے کہ میں دفتر جاؤں گا تو مہینہ کے آخر میں دس ہزار روپے تنخواہ ملے گی، چنانچہ رات کے دو بجے بھی اس کی ڈیوٹی ہوتی ہے تو چاہے آسمان زمین ٹل جائیں، مگر وہ ٹھیک وقت پر حاضر ہوگا، اور جب اس کے آٹھ گھنٹے پورے ہو جائیں گے تو کچھ لے کر نہیں لوٹے گا، جیسا خالی ہاتھ گیا تھا ویسا ہی خالی ہاتھ آجائے گا، جاتے ہوئے بھی گاڑی میں تیل اپنے پیسوں سے ڈلوائے گا اور واپسی میں بھی۔ اب اگر کوئی اس سے کہے کہ بھائی آپ جیسا بے وقوف کون ہوگا کہ اتنی پابندی سے ڈیوٹی پر جاتے ہو اور اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے تیل بھی ڈلواتے ہو، لیکن لاتے کچھ بھی نہیں، تو وہ جواب دے گا کہ بے وقوف میں نہیں ہوں، جناب عالی ہیں (ج: مخفف ہے جاہل کا، ن: نالائق کا، الف: الّو کا، ب: باؤلے کا اور عالی کے معنی ہیں: مہا، بہت بڑا) میں اگر چہ آج کچھ نہیں لاتا، مگر جب مہینہ پورا ہوگا تو لاؤں گا۔

میرے بھائیو! پھر عبادتوں میں اور احکام کی بجا آوری میں انسان کیوں یہ امید رکھے کہ میں گھر سے نماز پڑھنے جاؤں تو میری نماز کا سلام پھرتا نہیں چاہئے کہ میری جیب بھر جائے۔ دنیا کے کاموں میں ایک وقت کے بعد تنخواہ ملتی ہے، اسی طرح اللہ نے جو عبادتیں رکھی ہیں ان کے ثواب کے لئے بھی اللہ نے ایک وقت مقرر کیا ہے، اس وقت تک انتظار کیوں نہیں کیا جاتا، اور وہ وقت موت ہے، آنکھ بند ہوتے ہی ساری زندگی کے کئے ہوئے کاموں کا ثواب سامنے آجائے گا۔

یہ جو ثواب مرنے کے بعد ملے گا اس کو ذہن میں تازہ کرلیا جائے کہ میں جو روزے رکھتا ہوں اس کا ثواب مجھے ضرور ملے گا، میں جو تراویح پڑھتا ہوں تو مجھے اس کا ثواب ملے گا، اس ثواب کی امید کو تازہ کرنا مشکل سے مشکل کام کو آسان بنا دیتا ہے۔ غرض حضورؐ نے یہ فارمولہ بتایا کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے یقین کے ساتھ اور ثواب کی امید کے ساتھ اور جس نے تراویح پڑھی یقین کے ساتھ اور ثواب کی امید کے ساتھ، اور جس نے شب قدر میں عبادتیں کیں اسی ایمان واحتساب کے ساتھ تو تینوں کا بدلہ ہے: غُفِرَ له ماتقدم من ذنبه: اس کے گذشتہ تمام گناہ معاف ہو جائیں گے اور اس کی پچھلی تمام زندگی کا ریکارڈ صاف ہو جائے گا۔

چند مکفرات جمع ہوتے ہیں تو جلا پیدا ہوتی ہے:...... یہاں اگر کوئی شخص کہے کہ جب ان تینوں کا فائدہ ایک ہی ہے تو پھر تینوں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تینوں میں سے ایک کام کرلیا جائے تو ریکارڈ صاف ہو جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب چند مکفرات جمع ہوتے ہیں تو جلا پیدا ہوتی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھو: ہمارے ہندوستان میں جب عورتیں کپڑے دھوتی ہیں تو پہلے صابن لگاتی ہیں، صابن کیا کام کرتا ہے؟ میل کاٹتا ہے! پھر کپڑے کو کوٹتی ہیں اور پانی سے دھوتی ہیں، جب کپڑا صاف ہو جاتا ہے تو اس کو نیل میں ڈالتی ہیں، نیل کیا کام کرتی ہے؟ نیل کپڑے میں چمک پیدا کرتی ہے یا ایک پاؤڈر ٹینی پال ہے اس میں ڈالتی ہیں، وہ بھی کپڑے میں جلا (چمک) پیدا کرتا ہے، پھر جب کپڑے پریس ہو کر تیار ہو جاتے ہیں تو نہایت اجلے معلوم ہوتے ہیں۔

اب اگر کوئی کہے کہ بھائی جب تینوں (صابن، نیل اور ٹینی پال) کا کام ایک ہی ہے تو تینوں چیزیں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بس صابن سے دھوڈالو، کیا ضرورت ہے نیل ڈالنے کی؟ تو سب یہی کہیں گے کہ نہیں بھائی! ایسا نہیں ہے، اگرچہ سب چیزیں ایک ہی کام کرتی ہیں، مگر جب یہ سب چیزیں اکٹھا ہوں گی تو ان کی صورت کچھ اور ہو جائے گی۔

اسی طرح دو آنکھیں ہیں، جو کام ایک آنکھ کرتی ہے وہی دوسری بھی کرتی ہے، پھر دوسری بیکار ہوئی؟ نہیں! بیکار نہیں ہے، دو کا کام دو کا ہے، اور ایک کا کام ایک کا ہے، اسی طرح گناہوں کی صفائی اور معافی ایک کام سے ہوگی تو اس کی شکل اور ہوگی، اور تین سے ہوگی تو اس کی شکل اور ہوگی، اس سے آدمی کی صفائی بڑھ جائے گی۔

رمضان میں دو نمازیں الگ الگ ہیں:...... رمضان میں دو نمازیں الگ الگ ہیں، ایک نماز سونے سے پہلے ہے، اس کا نام قیام رمضان ہے، اسی کا نام تراویح بھی ہے، اس کی جماعت کے ساتھ بیس رکعتیں ہیں، اور یہ نماز سونے سے پہلے پڑھنی ہے، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو میں نے ابھی سنائی کہ تراویح مؤمن کے لئے سفارش کرے گی، سفارش کرتے ہوئے وہ کہے گی: اے اللہ! میں نے اس بندے کو سونے سے روکا، میں نے اس کو سونے نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ نماز سونے سے پہلے ہے۔

اور ایک دوسری نماز ہے جو پورے سال پڑھی جاتی ہے، اسے رمضان میں بھی پڑھنا ہے، اور وہ تہجد کی نماز ہے، جب

آپ سحری کے لئے اٹھیں تو سحری ہی میں نہ لگ جائیں، سحری ضرور کھائیں مگر تہجد بھی پڑھیں، یہ تہجد حضورؐ بارہ مہینے پڑھتے تھے اور اس کی آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے، رمضان کی وجہ سے اس کی رکعتوں میں اضافہ نہیں ہوتا تھا، لہٰذا جب ہم سحری کے لئے اٹھیں تو ہمیں تہجد کی آٹھ رکعتیں ضرور پڑھنی چاہئے، دوسرے گیارہ مہینوں میں تو ہم تہجد کے لئے اٹھ نہیں پاتے، لیکن رمضان میں تو سحری کھانے کے لئے اٹھنا ہی ہے، پھر ہم خرما و ہم ثواب کیوں نہیں کر لیتے، اور آٹھ پڑھنی ضروری نہیں، اگر آپ آٹھ نہ پڑھ سکیں تو چھ پڑھ لیں، چار کا موقعہ ہو تو چار پڑھ لیں، ورنہ کم از کم دو تو ضرور پڑھ لیں۔

تراویح کی نماز آسان ہے، **لوگوں نے اس کو مشکل بنادیا ہے**:......اور تراویح کو تراویح کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کہ ہر چار رکعت پر ترویحہ آتا ہے اس لئے اس کو تراویح کہتے ہیں اور ترویحہ کے معنی ہیں: آرام کرنا۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ تراویح کی چار رکعتیں جتنی دیر میں پڑھی جاتی ہیں اتنی دیر آرام کرنا چاہئے، پھر اگلی چار رکعتیں پڑھی جائیں، پھر اتنی ہی دیر آرام کیا جائے، دس منٹ میں اگر آپ نے چار رکعتیں پڑھی ہیں تو دس منٹ آرام کریں، مگر ہم اس طرح تراویح نہیں پڑھتے، اس لئے تھک جاتے ہیں۔

مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ جب ہم گھنٹے سوا گھنٹے میں تھک جاتے ہیں تو اگر دس دس منٹ وقفہ کریں گے تو ڈھائی گھنٹے لگیں گے، ڈھائی گھنٹے میں تو ہم اکڑ کر لاٹھی بن جائیں گے۔

میرے بھائیو! ایسا نہیں ہے، ہم جو جلدی جلدی پڑھتے ہیں یہی چیز ہمیں تھکا دیتی ہے، اتنا فٹافٹ جگاڑ چلتا ہے کہ رکوع وسجدہ میں دو مرتبہ بھی تسبیح نہیں کہہ پاتے، یاد رکھو جتنا جلدی کروگے اتنا ہی تھکوگے، اور اگر دس منٹ میں چار رکعات پڑھو اور دس منٹ آرام کرو، پھر اگلا ترویحہ دس منٹ میں پڑھو اور دس منٹ آرام کرو تو کبھی تھکن نہیں ہوگی، جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اس نماز کو بوجھ بنا رکھا ہے، ہم جلد سے جلد اپنے سر سے اس کو ٹال دینا چاہتے ہیں اور گھنٹے سوا گھنٹے میں نمٹ کر پھر چوراہے پر کھڑے کھڑے دو گھنٹے گپ کرتے ہیں، نہ نیند آتی ہے، نہ کسی کام کا تقاضہ ہوتا ہے۔

پس اگر **ایمانا و احتسابا** والا فارمولہ ہمارے پیش نظر رہے تو یہ نماز ہم پر بھاری نہیں ہوگی، بلکہ اس میں مزہ اور لطف آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مضمون کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں اور تمام عبادتوں کو ثواب کے یقین وامید کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین یارب العالمین) **وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین**۔

☆......☆......☆